Fikr-o-Nasar (Islamabad) 14:10-11 (1977)

شعورِ نبوّت اور شعورِ اجتہاد کی ضرورت

محمد تقی امینی

تغیر پذیر دنیا میں اسلام کے لئے دو قسم کے شعور کی ضرورت ہے۔

(۱) شعور نبوت اور

(۲) شعور اجتہاد

شعور نبوت سے مراد علم و حکمت کا نور اور فہم و ادراک کا وہ کمال ہے جو نبوت کے خلقی وجدان و داخلی شعور کا نتیجہ اور اس کے لئے لازم ہے اس کو یہ قوت بھی حاصل ہوتی ہے کہ برتر شعور یا نور سے تعلق جوڑ کر کسب فیض کرے اور ماورائی حقیقت سے حاصل کردہ علم و ادراک کو وحی الٰہی کی شکل میں پیش کرے یہ شعور علم و ادراک کا نہایت اونچا و محفوظ اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

شعور اجتہاد سے مراد وہ ملکہ یا ہیئت راسخہ ہے کہ جس کے ذریعہ شعور نبوت کے علم و ادراک سے اخذ و استنباط پر قدرت حاصل ہو۔ اس شعور کی تکوین شعور عقل اور شعور قلب دونوں کے آمیزہ سے ہوتی اور اس میں عقلی بصارت اور قلبی بصیرت دونوں کی نمود ہوتی ہے۔

ختم نبوت پر شعور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن یہ اس وقت ختم ہوا جب کہ شعور اجتہاد اس کی قائم مقامی کے قابل بن گیا۔ یعنی اس میں اس درجہ پختگی توانائی اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لئے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت نہ رہ گئی (جیسا کہ ختم نبوت سے قبل رسول اور نبی کے ذریعہ آسمانی ہدایت کا انتظار رہتا تھا) بلکہ وہ خود غور و فکر اور تلاش و جستجو سے یہ مسائل حل کرنے لگا۔

لیکن زندگی و معاشرہ کا تجربہ رکھنے والے ماہرین و مفکر اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ شعور عقل و شعور قلب کے فیصلے و نتائج طبعی خصوصیات و بشری کمزوریوں سے خالص و

بے آمیز نہیں ہوتے ہیں، بلکہ رسمی حجابات اور وضعی حالات ان دونوں میں اس قدر پیوست ہوتے ہیں کہ کلی طور پر انکو کسی وقت جدا نہیں کیا جا سکتا، ایسی حالت میں لازمی طور سے شعور اجتہاد جس کی تکوین میں دونوں کی آمیزش ہے اسکے فیصلے و نتائج نہ بالکلیہ خالص و بے آمیز ہوں گے اور نہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لئے اس کو آزاد و خود مختار چھوڑنے کی اجازت ہوگی۔ بلکہ ہر موڑ اور ہر موقف پر اس کے لئے بلند و برتر رہنما کی تلاش و ضرورت ہوگی کہ جس کی رہنمائی میں حتی المقدور اپنے فیصلے و نتائج میں نکھار پیدا کر سکے اور جس کا دامن عصمت اس کی تردامنی کے لئے ذریعہ نجات بن سکے۔

یہ رہنما شعور نبوت ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کے خالص و بے آمیز ہونے کی ضمانت نہیں ملتی۔

اس شعور سے رہنمائی حاصل کرنے کا براہ راست سلسلہ اگرچہ ختم ہوگیا۔ لیکن اس سے حاصل شدہ علم و ادراک کی دونوں قسمیں موجود و محفوظ ہیں۔

(۱) وہ علم و ادراک جو برتر شعور یا نور سے تعلق جوڑ کر شعور نبوت نے حاصل کیا ہے۔ جس کا تعلق خارجی و ماورائی حقیقت سے ہے۔ اس کا اصطلاحی نام "قرآن" ہے۔

(۲) وہ علم و ادراک جو نبوت کے خلقی وجدان و داخلی شعور کا نتیجہ اور قرآن کی معنوی دلالت سے اخذ و استنباط کیا ہوا ہے۔ اس کا اصطلاحی نام "حدیث" ہے۔

ان ہی دونوں کی رہنمائی میں شعور اجتہاد شعور نبوت کی قائم مقامی کا شرف حاصل کرتا اور اپنی چاک دامنی کے لئے رفوگری کا سامان مہیا کر کے فائز المرام ہوتا ہے۔

شعور کی اس وضاحت کے بعد اب اسلام اور تغیر پذیر دنیا میں غور کرنا چاہیئے۔ غالباً یہ بات ہم سب کو تسلیم ہے کہ اسلام کی حیثیت انکشاف حقیقت کی ہے، جو بذات خود ایک آئیڈیل ہے۔ سماجی عمل کی نہیں ہے کہ جس کا اپنا کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا بلکہ سماج ہی اس کے در و بست کا مالک ہوتا ہے، جو چیز انکشاف حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ہمیشہ باقی رہتی اور اسی کی روشنی میں تغیر پذیر دنیا کا مطالعہ ہوتا رہتا ہے اور جو چیز سماجی عمل کی حیثیت رکھتی ہے، وہ اس وقت تک باقی رہتی ہے، جب تک سماج اس کی اجازت دیتا ہے اور اگر اس

کی جگہ کوئی اور عمل یا طریقہ اختیار کر لیا گیا تو پھر وہ چیز تاریخی بن جاتی ہے۔

اسلام کی یہ حیثیت متعین ہونے کے بعد تغیّر پذیر دنیا میں اسلام کے باقی رہنے اور نہ رہنے کا سوال نہیں اٹھتا، بلکہ اصل سوال اس کی تعلیمات اور تغیّر پذیر دنیا کی تنظیمات میں ربط و تعلق کا رہتا ہے، یہ دنیا آج نہیں بلکہ ابتداء ہی سے تغیّر پذیر ہے، اسلام بھی نیا نہیں بلکہ شروع ہی سے اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے، اس بناء پر ربط و تعلق کا مسئلہ بھی کوئی انوکھا اور نیا نہیں ہے، انبیاء علیہم السّلام شعورِ نبوت کے ذریعہ یہ ربط و تعلق پیدا کرتے رہے، اور ختم نبوت کے بعد اجتہاد کے ذریعہ اس کو بحال رکھنے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔

تغیّر پذیر دنیا آسمان سے نہیں اُترتی بلکہ انسان کے ہاتھوں وجود میں آتی ہے جس میں خیر و شر دونوں کا وجود اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ظہور ہوتا ہے، اس سے گھبرانے اور مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جو انسان اس کو وجود میں لاتا ہے، وہی انسان اسلام کی نسبت سے خیر و شر کی حد بندی کر کے اور عدل و اعتدال کی قوت پیدا کر کے اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی کر سکتا ہے، انبیاء علیہم السّلام نے یہی حد بندی اور قوت پیدا کر کے اپنے وقت کی تغیّر پذیر دنیا کو بطور نمونہ پیش کیا تھا، اور ختم نبوت کے بعد اسی حد بندی اور قوّت کو بحال رکھ کر اسلام کو زندۂ جاوید ثابت کیا گیا تھا۔

ختم نبوت کے بعد جب ایرانی رومی، حبشی، قبطی، ترکستانی اور سندھی قوموں سے سابقہ پڑا جن کے حالات و معاملات مختلف تھے، معاشی و سیاسی نظام میں تفاوت تھا، کہیں پر ایرانی تہذیب و قانون کو دخل تھا، تو کہیں رومی تمدن و قانون کا اثر تھا، غرض عجمیوں کے اختلاط سے ایک عجیب کشمکش پیدا ہو گئی، اور ان کے ساتھ معاملات سے نئی نئی ضرورتیں اُبھر آئیں اور بہت سے نئے نئے مسائل حل طلب قرار پائے، جن کی وجہ سے عرب کی سادگی کو دھچکا لگا اور اسلام کی سادگی کو تمدّن کی چاشنی دے کر اس کے دامن کو وسیع کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت بھی یہی "اسلام ایک تغیّر پذیر دنیا میں" کا سوال اٹھا تھا، لیکن رہنمایانِ ملت کو اللہ تعالےٰ کروٹ کروٹ چین نصیب کرے کہ انہوں نے جس انداز سے اس سوال کو حل کر کے اسلام کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے اور نئے احوال و ظروف کو جس ہمت کے

ساتھ اسلام کے وسیع دامن میں سمیٹا وہ ہماری تاریخ کا نہایت روشن باب ہے، اگر خدانخواستہ ان پر جمود طاری ہوتا یا اسلام کو آزادی دینے والی طاقت کے بجائے اس کو معطل کرنے والی آہنی زنجیر سمجھتے تو اسلام صرف عرب میں محدود ہو کر رہ جاتا، اور ہمیشہ کے لئے اس کی عالم گیریت ختم ہو جاتی، پھر آج وہ اس قابل نہ رہتا کہ "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" سوالیہ نشان بن کر اس پر سمینار کیا جائے۔

یہ صحیح ہے کہ آج کی تغیر پذیر دنیا محض حالات کے اتار چڑھاؤ اور قوموں کی آمد و رفت سے نہیں رونما ہوئی، بلکہ ایک دور کے بعد دوسرے دور کے آنے سے ظہور پذیر ہوئی ہے، اس سے بھی انکار نہیں کہ بات صرف حاجت و ضرورت پر نہیں ختم ہوتی بلکہ منفعت کے حصول اور مضرت کے دفعیہ کا سوال ہے اور زندہ رہنے کے لئے موجودہ سرو سامان سے آراستہ ہونے کا معاملہ ہے۔

لیکن یہ حقیقت بھی تو مسلّم ہے کہ خیر و شر میں امتیاز اور خوبیوں اور خامیوں میں حد فاصل قائم کرنے کے لئے وہ پیمانہ موجود ہے جو شعور نبوت نے پیش کیا ہے، وہ نمونہ موجود ہے، جو ختم نبوت نے پیش کیا ہے، اور وہ طریق کار موجود ہے، جس کے ذریعہ شعور اجتہاد نے اسلام کی سادگی کو تمدن کی چاشنی کا رنگ دیا ہے۔

اب اس شعور اجتہاد کے ذریعہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ تغیر پذیر دنیا میں کس چیز کو لینا اور کس چیز کو چھوڑ دینا ہے، کس میں کاٹ چھانٹ کرنا اور کس سے نظر بچا کر نکل جانا ہے، کس کو لعینہٖ قبول کرنا اور کس کو بالکلیہ نظر انداز کر دینا ہے، کس میں نئی روح پھونکنا اور کس کے لئے نیا قالب تیار کرنا ہے، عبوری مرحلہ کس طرح گزارنا اور ہنگامی حالات کا کیسے مقابلہ کرنا ہے، اور سب سے بڑی بات فطرت کی کاٹ چھانٹ کو سمجھنا اور اس سے عبرت و بصیرت حاصل کرنا ہے کہ فطرت خود ہر گوشہ میں کاٹ چھانٹ کرتی اور خوب سے خوب تر شے کو فٹ کرتی رہتی ہے، جب کوئی شے ایک جگہ فٹ ہو گئی تو وہ کمتر شے کے لئے جگہ نہ چھوڑے گی، بلکہ قبضہ کے لئے اس سے بلند و برتر شے کا ہونا ضروری ہے۔

اس "دیکھنے" میں شعور نبوت کی "حکمت عملی" کو اپنانا ہوگا جس نے اپنے وقت کی تغیر پذیر دنیا میں "ازالہ" کے بجائے "امالہ" کی روش اختیار کی اور خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول پر عمل کر کے

چیزوں کو قبول کیا ۔

اس "دیکھنے" میں بنیادی نقطہ نگاہ یہ بنانا ہوگا کہ اگر اس وقت محسن کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف فرما ہوتے تو منفعت کے حصول اور مضرت کے دفعیہ کا کس قدر لحاظ فرماتے اور تدریج و تخفیف کے کن اصولوں پر عمل کر کے لوگوں کی دلجوئی کرتے ۔

اس "دیکھنے" میں ہر نظر و صلاحیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ اس کی نظر و صلاحیت درکار ہوگی جو اس فن کا ہو اور جس کا اصطلاحی نام "فقیہ" ہے ،

الفقیہ العالم الذی یشق	فقیہ وہ عالم ہے جو احکام کا تجزیہ کرتا،
الاحکام ویفتش عن حقائقھا	ان کے حقائق کی تفتیش کرتا اور
ما استغلق منھا (جار اللہ زمخشری	ان کے مشکل امور کو واضح کرتا ہے،

کتاب الفائق جز ثانی ۔ فقہ)

فقیہ کے لئے معاملہ فہمی و دنیوی مصلحت شناسی بھی ضروری ہے ۔

فقیھاً فی مصالح الخلق فی	دنیوی امور میں خلق خدا کی مصلحتوں
الدنیا ۔ (الغزالی احیاء العلوم ج ۱	کا رمز شناس ہو ۔

(الفظ الاول الفقہ)

غیر فقیہ سے اس رسائی اور رفتی الہام کی توقع نہیں ہے، جو اسلام اور تغیر پذیر دنیا میں ربط و تعلق پیدا کرنے کے لئے درکار ہے ،

فقیہ کے لئے اللہ سے گہرا تعلق بھی ضروری ہے کہ اس راہ کے مسافروں نے ہمیشہ اسی سے قوت و مدد حاصل کی ہے، یہ تعلق صرف ضابطہ کا نہیں بلکہ رابطہ کا ہونا چاہیئے جس کے لئے مقررہ احکام کی بجا آوری کے ساتھ آہ سحر گاہی کا التزام بھی نہایت سود مند ہے ۔

دیکھنے میں اس اہتمام و احتیاط کے باوجود قدم قدم پر شدید مخالفت ہوگی، اگر ایک طبقہ تر دامنی کا الزام لگائے گا، تو دوسرا چاک گریبانی کا طعنہ دے گا، کسی کو جدید سے گھبراہٹ ہوگی تو کوئی قدیم سے برافروختہ ہوگا، اپنوں کی ناراضی اور بیگانوں کی شماتت کا مقابلہ آسان نہیں ہے، لیکن اس راہ کے مسافروں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے گھبرانا اور پریشان نہ ہونا چاہیئے، بس اللہ کا نام

لے کر اور اسی کی تائید و نصرت کے بھروسہ پر کام شروع کر دینا چاہیئے، اور پامردی کے ساتھ اسے جاری رکھنا چاہیئے، اور اگر کوئی اس کے لئے تیار نہیں ہے تو اس سے بس اتنا ہی کہنا ہے کہ :-

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اسی شعور اجتہاد (جس کی تکوین عقل و قلب کے آمیزہ سے ہوتی ہے) کے ذریعہ موجودہ تغیر پذیر دنیا میں ان بنیادوں کی نئی تعبیر و تشریح کرنا ہے، جن پر اسلامی تعلیمات کا مدار ہے اور ان نظریات کا جواب تلاش کرنا ہے جنہوں نے ایمان و اعتقاد کی بنیادیں ہلا دی ہیں، اور انسان کی نئی توجیہ پیش کر کے اصول دین تک کو مشکوک بنا دیا ہے، جس کی وجہ سے فتنۂ ارتداد ہمارے گھروں میں گھس چکا ہے، اور ہم بے بس تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں، اس صورت حال کو بدلنے کے لئے بڑے سلیقہ اور دانشمندی کی ضرورت ہے، اب ہمیں چاہیئے کہ

(۱) انسان کی نفسیاتی توجیہ اس انداز سے کریں کہ اس کی نورانی اصل نمایاں ہو جائے اور (۲) تحت الشعور کے ان مخفی تاروں کی نشاندہی کریں جن کا براہ راست تعلق ایک ذی شعور طاقت سے ہے اور جن کو چھیڑے بغیر زندگی کے ساز میں سوز نہیں پیدا ہوتا، اور بہت سے نغمے خاموش رہتے ہیں، ہمیں یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ (۳) تحت الشعور میں ایک ذی شعور طاقت سے محبت کی کارفرمائی ہے جو حیات اور روحِ حیات کا سرچشمہ ہے، اسی کے ساتھ (۴) اخلاق و اقدار کی حقیقی و دائمی حیثیت کا جدید انداز میں ثبوت فراہم کرنا، نیز (۵) اس ذریعۂ علم کا جدید انداز میں ثبوت فراہم کرنا ہوگا، جس کی رسائی ماورائے محسوسات تک ہے، اور یہ سمجھانا ہوگا کہ (۶) خیر و شر اور طیب و خبیث (۷) کی شناخت کے لئے ایسے پیمانہ کی ضرورت ہے، جو انسانی جذبات و خواہشات کی گرفت سے آزاد ہو۔

مندرجۂ بالا خیالات کے اثبات کے ساتھ ان نظریات کی تردید بھی ضروری ہے جو ان کے خلاف ہیں مثلاً

(۱) انسان کی ایسی میکانکی توجیہ جو اس کی نفسی ساخت میں خود شعوری کے وصف اور ایک ذی شعور طاقت کی کارفرمائی سے انکار کرے اور نورانی کے بجائے اس کی اصل مادی و حیوانی قرار دے۔ (۲) تحت الشعور میں جنسی خواہش یا جذبۂ اقتدار کو اصل الاصول تسلیم کرے، (۳) اخلاق و اقدار کو اضافی قرار دے کر اسلام کو ایک سماجی عمل ثابت کرے (۴) ذرائع علم کو صرف محسوسات تک محدود

رکھے اور ماورائے محسوسات سے انکار کردے (۵) اخلاق و اقدار، خیر و شر، طیّب و خبیث کے لئے وہ معیار و پیمانہ تسلیم کرے، جو انسانی جذبات و خواہشات کا ساختہ و پرداختہ ہے، ان افکار و نظریات کی تردید میں بھی بڑی دانائی اور ہوشمندی سے کام لینا ہوگا۔

اس نئی تعبیر و تشریح اور تردید و تنقید کے لئے فقیہ کی نظر و صلاحیت درکار ہے، لیکن یہ اصطلاحی فقیہ نہیں بلکہ قرآنی فقیہ ہے، جو "حکیم" کے ہم معنی ہے، اور جس کی مناسبت سے فقہ بھی صدر اوّل میں علم و حقیقت (وہ علم جس میں الٰہیات اللہ کی ذات و صفات سے بحث ہو) علم طریقت (جس میں نجات دلانے والے اور ہلاکت میں ڈالنے والے اعمال و افعال سے بحث ہو) اور علم شریعت (جس میں ظاہری احکام و مسائل سے بحث ہو) تینوں کو شامل تھا۔

اس فقیہ کے لئے حکمت فرنگی کے ساتھ اس حکمتِ ایمانی سے واقفیت بھی ضروری ہے، جو اسلامی اصول سے والہانہ عقیدت اور اللہ و رسول سے شدید محبت کے سرچشمہ سے پھوٹتی ہے، جس کی طرف اشارہ مولانا رومی نے کیا ہے،

چند خوانی حکمتِ یونانیاں (افرنگیاں) حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں

(بشکریہ 'معارف' اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۷۷ء)

****